ہندوستان کے نو آبادیاتی عہد کا مطالعہ

Study of India's Colonial Era

نیلم امبرین [i] ڈاکٹر رافعہ ملک [ii]

Abstract:

Colonialism refers to a form of political domination that exployed various methods to control populations. It is not an inherent or rational structure but a deliberately created condition that devides society into two groups. The colonizers and the colonized. The colonizer possesses extensive power both tangible and symbolic which is used to oppress the colonized people with its inherently dual native colonialism sets up systems such as the courts, police and educational institutions to further this exploitation. In India, colonial, period is often traced to 1857. Under such rule, colonized people generally develop two contrasting attitudes, one of resentment and detachment and the other of attraction and integration. This was also the are in India, these opposing perspectives were evident among Indians during the time of British rule.

Keywords: *Colonialism, Political, Population, Court, Police, Educational institution, India, British, Rule, Colonized People.*

استعماریّت ایک ایسی سیاسی بالادستی کی صورت ہے جو انسانی معاشروں پر قابو پانے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتی ہے۔ یہ کوئی فطری یا معقول ساخت نہیں بلکہ ایک دانستہ طور پر پیدا کی گئی حالت ہے جو معاشرے کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتی ہے: ایک قابض اور دوسرے استعمار کے زیرِ اثر محکوم۔ قابض کے پاس وسیع اختیارات ہوتے ہیں، جو مادی بھی ہوتے ہیں اور علامتی بھی، اور انھی کے ذریعے وہ محکوم لوگوں کو دباتا ہے۔ اپنی اس دوہری ماہیت کے باعث، استعمار عدالتیں، پولیس اور تعلیمی ادارے بہ طور نظام قائم کرتا ہے، تاکہ اس استحصالی عمل کو مزید مضبوط بنایا جا سکے۔ ہندوستان میں استعماری دور کا آغاز عموماً ۱۸۵۷ء سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ایسے نظام کے تحت محکوم لوگوں میں عموماً دو متضاد رویے پیدا ہوتے ہیں: ایک نفرت اور بیگانگی کا، اور دوسرا کشش اور ہم آہنگی کا۔ ہندوستان میں بھی برطانوی دورِ حکومت کے زمانے میں یہی دونوں متقابل رجحانات اہلِ ہند کے درمیان نمایاں تھے۔

کلیدی الفاظ: استعماریت، نوآبادیات، ہندوستان، عدلیہ، پولیس، تعلیمی ادارے، انتظامیہ، استعمار زدہ۔

نوآبادیاتی نظام سے مراد کسی خطہ میں قوموں کا ایک ملک سے دوسرے ملک جا کر اپنی نئی زندگی آباد کرنا اور نئی آبادکاری وجود میں لا کر قابض ہونا ہے۔ نوآبادکار حقیقی طبقوں کا استحصال کرکے دولت لوٹ کر اپنے وطن میں بھیجتے ہیں۔ مغرب کی نوآبادیات کا عہد سولھویں صدی سے بیسویں صدی تک کے نصف اول تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ نوآبادیاتی نظام پہلے دور کی حکمرانی سے بالکل الگ تھلگ تھا۔

اپنی سرحد کی حدود سے آگے دوسری قوموں کے حکمران کو ختم کرکے وہاں اپنی حکومت کو مضبوط کرنا اور وہاں کے لوگوں کے وسائل اور حقوق کا استحصال، معاشی اور معاشرتی لحاظ سے کمزور کرنے کے بعد

[i] اسکالر پی ایچ۔ ڈی، شعبہ اردو، NCBA&E، لاہور، ملتان کیمپس۔
[ii] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، NCBA&E، لاہور، ملتان کیمپس (Corresponding Author)

اپنے باپ دادا کے شہر کو ذریعہ معاش پر پختہ کرنا نوآبادیاتی نظام کہلاتا ہے۔ نوآبادیاتی عہد میں انسانوں کے نظریہ پر قانونی اقتدار بالکل بھی وجود میں نہ تھا۔ وہاں کے باشندوں کو غلطیوں پر سخت سے سخت سزا دی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے ملازمین کو بندوق سے مارنے کے جرم میں برطانوی کو اس دور کے حساب سے سو روپیہ اور ایک سال کی قید کی سزا دی جاتی تھی جب کہ برصغیر کے لوگوں کو انگریزوں کی خواتین سے جبر و تشدد کی سعی کرنے کے جرائم میں بامشقت بیس برس کی سزائیں دی جاتی تھیں۔

سیاسی مسائل کی وجہ سے حقوق کے مطالبات اور اختلاف رائے کو الگ الگ قوانین کے نفاذ کے حوالے سے تباہ و برباد کر دیا گیا۔ ہندوستان میں نیا قانون کسی حد تک مشکل تھا لیکن برطانوی سماج نے ہندوستانیوں کو کمزور کرنے کے لیے ہر وہ حربہ استعمال کیا جس سے وہ معاشی اور معاشرتی لحاظ سے کمزور ہو جائیں اور ان کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائیں۔ برطانوی استعمار کے یہاں رحم نام کی کوئی چیز نہیں تھی، ذرا ذرا سی غلطی پر وہ ہندوستانیوں کو قتل کرنے کے درپے ہوتے تھے۔ کیوں کہ انھیں ہر صورت اپنا تسلط قائم کرنا تھا اور ہندوستانیوں پر اپنا رعب و دبدبہ قائم کرنا اور ان کو پستی کا احساس دلانا ان کا اولین مقصد تھا۔

سرمایہ کاری کی حفاظت کے ہر اعلیٰ سرکاری عہدے پر یورپین لوگوں کو فائز کیا گیا، ریلوے میں یورپی شخصیات کو تعینات کیا گیا۔ ہندوستانیوں کے لیے تعلیم اور نوکریوں کے دروازے بند کر دیے گئے تاکہ وہ معاشی لحاظ سے اتنے کمزور ہو جائیں کہ ان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائیں اور کبھی بھی ان کے مد مقابل کھڑے نہ ہو سکیں۔

نوآبادکار اپنے دفاتر، اپنی اقامت گاہیں اور چھاؤنیاں مقامی لوگوں سے مختلف رکھتے تھے۔ نوآبادیاتی عہد میں جس طاقت کا استعمال برطانوی کر رہے تھے اس سے صرف اور صرف وہاں کے لوگوں کا استحصال ہو رہا تھا۔ لوگ معاشی اور معاشرتی لحاظ سے کمزور اور ذہنی طور پر مفلوج ہو رہے تھے۔ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے عاری تھے۔ اس طرح کے حالات سے صرف برصغیر کے مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی متاثر ہوئیں۔ ایسے حالات و واقعات سے "تانیثیت" اثر انداز ہوئی۔ فیض احمد فیض نے خواتین کی دماغی حالت کو ایک گرفتاری کے برابر کہا ہے۔ قید کے دنوں کے ضمن میں وہ ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

قید سے پہلے پردہ نشین خواتین کی زینت کا کبھی ایسا صحیح شعور پیدا نہیں ہوا تھا جیسا کہ

> اب ہے۔ یہ زینت ہر قیدی کی عام زینت ہے اب معلوم ہوا کہ کم ظرفی، گھٹیا پن، چھوٹی چھوٹی الجھنوں سے اتنی لگن کہ وہ عالمگیر مسائل دکھائی دینے لگیں اور واقعی اہم اور غیر ذاتی مسائل سے قطعی بے تعلق، کینہ پرور، بدمزاجی کبھی خودسری کبھی خاک بوسی کبھی ہاتھ پاؤں ہلانے سے قطعی گریز۔[۱]

اردو ادب میں حقوق نسواں کی ابتدا غزل میں دکھائی دیتی ہے۔ اُردو ادب میں عورتیں شاعر کی حیثیت سے نظر آتی ہیں مگر زندگی کی الجھنوں کا شکار۔ خواتین کو مرد شاعر حضرات نے بھی اپنی شاعری کا ایک اہم حصہ بنایا، لیکن عورت کو ہمیشہ مختلف چیزوں سے تشبیہات دی گئیں۔ عورت کا موقف ہمیشہ سے یہ رہا کہ اسے بحیثیت انسان سب سے پہلے پہچانا جائے۔ اُردو ادب میں تانیثیتی تحریک کو ترقی پسند تحریک کی طرف سے کافی تقویت ملی۔ ترقی پسند ادیبوں نے تانیثی افکار کو اجاگر کیا اور عورتوں کے ساتھ آواز بلند کی۔

اُردو ادب میں نوآبادیاتی حوالے سے نسوانی نظریات صغریٰ ہمایوں، نذر سجاد، ممتاز شیریں، فرخندہ لودھی، خدیجہ مستور، رضیہ فصیح احمد، رضیہ بٹ، وحیدہ نسیم کے پاس ملتے ہیں۔ نوآبادیاتی برصغیر میں نثر میں نسوانی اقرار کے سوا اس سے پہلے عورتوں نے شعر و ادب کے ماحول میں طبع آزمائی کی۔ جس میں شمس النسا امیہ، پروین، لطف النساء، ماہ لقا چندا بائی، جمیلہ، حجاب، سلطانی بیگم، زاہدہ خاتون، نواب صدر محل بیگم، خیر النساء، نوشابہ خاتون، شفیقا تسنیم وغیرہ جیسے نام شامل ہیں۔ معاشرے کے مسائل اور روک ٹوک کے موضوعات پر خواتین کی تحریروں کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ جدید عہد کی معروف شاعرات میں سے پہلا نام ادا جعفری کا آتا ہے، دوسرا اہم نام زہرہ نگاہ کا ہے۔ زہرہ نگاہ اپنے ریت ورواج کے طرز اور شعری فن کی طاقت کے سبب ایک توانا شاعرہ مانی جاتی ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے نصف تک برصغیر میں برطانویوں نے قدم جما لیے تھے۔ تجارتی اور سیاسی فتح کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے پنجے گاڑے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر ۱۸۱۳ء میں جب تجدید وجود میں آئی تو اس میں ایک جدید شق کو مزید بڑھا دیا گیا۔ جن کی مدد سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہندوستان کی تعلیمی تدریس پر ایک لاکھ سے زائد خرچہ کرے۔ جن کی وضاحت کا مفہوم یہ تھا "واقفیت کے اہم معاملے میں مداخلت کی کمی" اور نہ ہونے کے اصول پر مد نظر رکھا گیا۔ ہندوستان کے عہد اور تعلیمی نظام اہم

جزو ہے۔ ۱۷۹۰ء میں چارلس گرانٹ نے "ہندوستان کی تعلیمی اور اخلاقی حالت کا نقشہ کچھ ایسا کھینچ کر دکھایا کہ جیسے ہندوستانی جاہل اور وحشی لوگ ہوں۔ اس نے اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ برطانوی حکومت ہندوستانیوں کی تعلیم کی ذمہ داری قبول کرلے۔ نیز انھیں مغربی علوم، سائنس اور ٹیکنالوجی کے علاوہ عیسائیت کی تعلیم دے۔"[۲]

چارلس گرانٹ کے تصورات سے واضح ہے کہ ہندوستانی لوگ وحشی اور جاہل ہیں۔ ان کو معتبر بنانے کا ایک طریق انگریزوں کی تعلیم اور یورپ کی تہذیب کی ترویج ہی ہے۔ ہندوستان کی تعلیم کے لیے دس سال تک ایسٹ انڈیا کمپنی نے کوئی خصوصی خرچ نہ کیا۔ نوآبادیاتی دور کے اُردو ادب نے اسلامی تعلیم کی وسعت اور مقبولیت کی شکل میں اپنی جگہ قائم کی۔ بیسوی صدی کے شروع میں بہت سی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ فورٹ ولیم کالج نے ان کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ شاعری، نثر اور تراجم کی وجہ سے مختلف زبانوں کو تقویت ملی اور اس دوران ہندوستانیوں نے عورتوں اور مردوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ ہندوستان میں مختلف کلچر اور زبانوں کے الفاظ ایک دوسرے میں ضم ہونا شروع ہو گئے، جس کے نتیجے میں ایک زبان کے اندر مختلف زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے چلے گئے۔ اور حالت یہ گئی کہ یہ ان میں انتخاب کا مسئلہ پیدا ہو گیا کہ "ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا چاہیے۔ Water کے لیے "پانی"، "جل" اور "آگ" تینوں ہی قابل قبول ہیں۔ مگر بنگالی اور مہاراشٹرا میں صرف "جل" ہی استعمال میں ہے، مگر مراٹھی میں "تعلیم" کے ساتھ تھوڑے بہت مختلف مرکب الفاظ بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔"[۳]

لیونل فیلڈن (۱۸۹۶۔ ۱۹۷۴ء) براڈ کاسٹنگ کا خاص ممبر تھا۔ اگست ۱۹۳۵ء میں انڈیا براڈ کاسٹنگ سروس میں کنڈولر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ آل انڈیا ریڈیو کے لیے تفصیلی خبروں میں ہندوستان کے متعلق وضاحت اور قطعی موقف منتخب کرنے میں کامیاب رہے۔ فیلڈن بیان کرتا ہے:

> یہ آل انڈیا ریڈیو بہت سی عملی مشکلات سے محفوظ رکھتی ہے۔ اگرچہ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ تنقید سے مکمل طور پر مبرا نہیں۔ گرامر اور نحو کے اعتبار سے "اُردو" اور "ہندی" عملی لحاظ سے ایک جیسی ہیں اور دونوں میں ایک قابل قدر ذخیرہ الفاظ مشترک ہے تاہم تین ایسے عناصر ہیں جو انھیں ایک دوسرے سے جدا

> کرتے ہیں۔ پہلا یہ کہ ہندی دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور اُردو، فارسی، عربی وجوہ کی بنا پر ہندی کو ہندوؤں اور اُردو کو مسلمانوں سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ تیسرا یہ کہ اُردو کے مصنفین اپنے طرف مائل ہیں اور ہندی کے مصنفین سنسکرت کی طرف، للذا یہ ممکن ہے کہ ایک انتہا پر کسی مسلمان کی فارسی عربی حروف میں ایک ایسی تحریر ہو جس میں فارسی اور عربی الفاظ کی بھرمار ہو۔ اور دوسری انتہا پر ایک ہندو مصنف کی دیوناگری رسم الخط میں ایک ایسی تحریر ہو جو سنسکرت الفاظ سے بھرپور ہو۔ یوں ان دونوں کے درمیان خلیج اتنی وسیع ہو سکتی ہے کہ ایسا قاری شاید ہی ہو سکتا ہے جو یکساں سہولت کے ساتھ دونوں کی تفہیم کر سکتا ہو۔ اور بلاشبہ بہت سے افراد بھی ہو سکتے ہیں جو ان دونوں کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اگرچہ ان دونوں انتہاؤں کے بیچ بہت سی اقسام میں ''ہندی'' یا ''اردو'' کا لیبل چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ نشریات میں ایسا کرنا مزید دشوار ہوگا کیوں کہ بولا گیا لفظ رسم الخط کی قید سے آزاد ہے جو ہندی اور اُردو میں تفریق کی اہم ترین علامت ہے۔[۴]

نوآبادیاتی نظام کے تناظر میں جن ریاستوں میں ہندی زبان کی پہچان ہندوستان کے خطے کے حوالے سے کی گئی، ادھر ان کو تعلیمی ادب کا درجہ دیا گیا:

> ایران اور ہندو اشرافیہ کے درمیان ثقافتی رقابت اور مفادات کے ٹکراؤ کی ایسی صورت تھی جس میں ''زبان'' مختلف سطحوں پر ہم آہنگی کی علامت کی حیثیت اختیار کر گئی جسے معاشرتی درجہ بندی میں اپنی اپنی حیثیت کے دفاع اور فروغ کے حوالے سے معاون سمجھا جاتا تھا۔ للذا یہ کہنا درست ہوگا کہ نوآبادیاتی پالیسیاں جہاں ہندی اور اُردو کی تشکیل اور ان کے زبانوں کے حسب نسب پر اثر انداز ہوئیں وہیں دونوں زبانوں کے نظریہ ساز اور کرتا دھرتا۔[۵]

ہندوستان میں تراجم کرانا ایک بہت بڑا اہم کارنامہ تھا۔ مگر ان میں مشکل یہ تھی کہ کسی بھی زبان کے علم و ادب کو دوسری زبان میں تبدیل کرنا آسان نہ تھا۔ اس کے معنی و مفہوم تک پہنچنا بہت اہم ذمہ داری تھی، چوں کہ اس کے بغیر کسی بھی ادب کو دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا، اس لیے اردو اور

ہندی ادب کو دوسری زبانوں میں منتقل کیا گیا اور جواز دیا گیا:

> ایسا نہیں ہے کہ ہم ان کے خلاف ہیں۔ نشریاتی اسٹیشنوں کے سوا جیون کو بلاشبہ اُردو بننی چاہیے۔ تاہم انھیں اپنے کوڈ نہیں بھلانے چاہیں۔ صوبہ ہائے متحدہ، ہندی کا گڑھ ہیں، ہندی بولنے والوں کی تعداد بے شمار ہے اسی وجہ سے ان کی زبان استعمال کرنی چاہیے۔[۶]

اُردو اور انگریزی میں انگریزوں کی بغاوت کو ختم کرنے کے لیے سر سید نے وولائل محمڈنز آف انڈیا تحریر کی۔ اس تصنیف میں ۱۸۵۷ء کے اہم اور سنگین دور میں انگریزوں کا معاون و مددگار بننے کے لیے انھوں نے مسلمانوں کا تذکرہ کیا۔ ولیم میور جنھوں نے اسلام کے خلاف مسلم علماء کرام کے دلائل اور اقوال کے ساتھ لائف آف محمد تحریر کی۔ خطبات احمدیہ ان کے جواب میں تحریر کی گئی۔ ان سب اعتراضات پر استدلال سے جوابات دیے گئے جو عیسائی عام طور پر اسلام پر کرتے تھے۔ مثلاً جہاد، بیویوں کی کثیر تعداد، غلامی کی روایت، طلاق، معجزے، جو شق صدر اور معراج نبیؐ وغیرہ پر ہوتے رہتے تھے۔ سر سید خطباتِ احمدیہ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ایک اخبار میں کسی انگریز نے لکھا تھا کہ عیسائیوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے ان ہی کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے دکھایا ہے کہ اسلام ان داغ دھبوں سے پاک ہے۔[۷]

اس عہد میں انگریزی علوم کا رواج تھا، انگریزی زبان کے استعمال سے مسلمان متاثر ہوئے لیکن بعد میں وہاں کے نظام تعلیم کا غور و فکر سے مطالعہ کیا گیا تو وہاں ایسے اداروں کا وجود قائم کیا گیا جو جدید علوم کے خلاف مسلمانوں میں بغاوت کا عنصر ختم کرنے کے لیے سیاسی و ادبی خدمات سر انجام دینے لگے۔ جدید لٹریچر، سائنس اور فلسفہ کو مقامی زبان میں تراجم کے لیے "سائنٹفک سوسائٹی" وجود میں لائی گئی۔ اس سوسائٹی نے "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے رسالہ قائم کیا جو تمام سماجی، اخلاقی، سیاسی اور علمی عنوانات پر مقالات شائع کرتا تھا۔

۱۸۵۷ء کے بعد سر سید نے دس برس تک جو بھی خدمات سرانجام دیں، ان میں ہندو اور مسلمان

برابر کے شریک تھے۔ مثلاً غازی پور کا مدرسہ برٹش ایڈیشن ایسوسی ایشن، مراد آباد کا یتیم خانہ، صوبہ جات متحدہ میں تعلیمی کمیٹیاں، علی گڑھ کالج وغیرہ لیکن ہندو اور مسلمانوں میں بغاوت پیدا کرنے کے لیے خصوصاً تدابیر قائم کی گئی۔ آج جب ہم سرسید احمد خان کے نظریات سے مستفید ہوتے ہیں اور دنیا میں آج کے دور کے سیاسی منظر پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پھر وہ منظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں جب حالی نے سرسید کی وفات پر بیان کیے تھے:

> آپ جو سرسید کے ہم مذہب ثناخواں ہیں اور اگر آپ کا یہ غم والم سچا ہے تو کیا آپ کو رونے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں؟ سمجھ لیجئے یہ شخص جس کو آپ رو رہے ہیں یہ اس قدر مفلس تھا، کہ نہ اس کے پاس رہنے کو گھر تھا، نہ مرنے کو، لیکن پھر بھی اس نے ایک دولت آپ کے لیے چھوڑ دی۔[۸]

نوآبادیاتی نظام اس سے قبل کے دیگر اقتدار کے نظام سے الگ اس وجہ سے تھا کہ ان میں قبضہ گروہ کی قوموں سے جو تعارف تھا وہ ظلم و تشدد اور زبردستی پر قائم تھا۔ اس حکومتی نظام اور حکمت، تعلیم اور تفکر کے ہاں اقتدار کی گفتگو کی گئی اور خون پی کر عدل وانصاف کا درس دیا گیا تھا۔ اہل ہندوستان نے اس نظام کو رونما کیا اور آزادی کے لیے کوشش اور حکمت عملی قائم کی گئی۔ سرسید نے لوگوں کو رسوائی سے دور رکھنے کے لیے تدابیر اختیار کیں۔ انھوں نے دوستوں اور دشمنوں کی بغاوت کا سامنے کرتے ہوئے ثابت قدمی جرات، شجاعت و دلیری اور مستقل مزاجی کے ساتھ معاشی بحران، اصلاحی، تعلیمی، معاشرتی، سیاسی، ثقافت اور اخلاقی الغرض ہر لحاظ سے قوم کی سربلندی کی جنگ لڑی۔

دنیا کی موجودہ صورت یہ ہے کہ اس عہد میں دوسری جنگ کے بعد بظاہر تو نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ مگر آج دنیا نوآبادیاتی نظام سے نوآبادیاتی سیاست کی جدید صورت اختیار کر رہی ہے۔ جو ظلم و جبر، دھوکا دہی کی جانب پیش قدم ہے۔ اس کو جدید طرح کا نوآبادیاتی نظام کا عہد بھی کہا جاسکتا ہے۔ جن کے حوالے سے آزاد ممالک خود اپنی آزادی پر باعثِ فخر ہیں اور مختلف قسم سے سامراج نفسیاتی قسم کے لوگ اپنے اپنے ممالک کے ذمہ دار بھی ہیں۔

نوآبادیاتی نظام میں جو اس دور میں دنیا کا دوسرا امیر ملک چین کے بعد ہندوستان ہی ہے، دنیا کی

۲۵ فی صد کا جی ڈی پی معیشت کا حامل تھا۔ ول ڈیونٹ تہذیب کی داستان میں یوں تحریر کرتے ہیں:

> برصغیر میں جہاز بننے کی صنعتیں رسائل اور ٹیکسائل بہت زیادہ ترقی پذیر ثابت ہوئے تھے مگر برطانوی قابض ہونے سے پوری صنعتیں برباد ہو گئی، یوں ہندوستان کی صنعتوں کی تباہی ہوئی۔ ان کا طرز ۱۷۷۲ء میں ولیم پوسٹسن کے بولے جانے والی ان گفتگو سے لگایا جاسکتا ہے: "ہر سامان جو تیار کیا جاتا ہے وہ کمپنی کی ملکیت بن جاتا ہے اور انگریز اپنے بنیوں اور گماشتوں کے ذریعے انتہائی تکبر سے یہ طے کرتے ہیں کہ ہر کاریگر کتنا مال کس قیمت پر دے گا۔ جب ان باتوں کے تصفیے سے ہندوستانی جلاہے کمپنی سے پیشگی روپیا لینے سے انکار کرتے ہیں تو وہ روپیا زبردستی ان کی فکر میں بندھوا دیا جاتا ہے اور پھر اس جلاہے کو کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ اس محکمے میں جو بدمعاشیاں کی جاتی ہیں وہ وہم و قیاس میں بھی نہیں آ سکتیں۔ کمپنی کے گماشتے جو نرخ مقرر کرتے ہیں وہ بازار کے نرخ سے چالیس فیصد کم ہوتا ہے۔[۹]

برصغیر کے برطانوی نوآبادیاتی لوٹ کھسوٹ کے پست حال نمونے بیان کیے جاسکتے ہیں۔ اس عہد میں مسلمانوں کی کیفیت بہت ناساز تھی۔ جنگ آزادی کے بدلے جو حالت، ظلم مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے ان سب کی فہرست بہت بڑی ہے۔ دہلی میں خصوصاً مسلمان بستی تباہ کرکے ان کی جگہ ہندو قوم کو آباد کر دیا گیا۔ ہر طرف قتل و غارت تھی۔ عمارتوں کو مسمار کر دیا گیا۔ وہاں کے تدریسی ادارے بھی سنسان کر دیے گئے۔ صوفیا کے روحانیت والی درس گاہیں، خانقاہیں برباد کر دی گئیں، بادشاہوں کے شاہی قلعے کی لائبریریاں ختم کر دی گئیں۔ ان میں ہمایوں کے ذخیرے، جو کہ اکبر کے دور کی تصانیف (تراجم)، جہانگیر کے دور کی صنعتی کاریگری کی مثالیں موجود ہیں۔

مسلمان اس پورے حالات و واقعات سے پست حال اور لاچار ہوتے چلے گئے۔ یہ وہی لوگ تھے جو کچھ عرصے قبل حکمرانی کرتے تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات و واقعات کا یہ ایک بہت عظیم اور درد ناک دور تھا۔ اس دوران زوال یافتہ قوم میں بہادری اور اعتماد قائم کرنے والی تحریک سرسید کی علی گڑھ

تحریک تھی جو کہ ایک ہمہ گیر تحریک ثابت ہوئی۔ سر سید اس دور میں بہت افسردہ تھے۔ سر سید نے یقیناً قوم کی خاطر گالیاں کھائیں لیکن کبھی کسی کو بددعا نہ دی۔ ایک بار مسلمان کے لیے انڈین آبزرور کے ایک مقالہ نگران نے لفظ "سور" استعمال کیا تو پھر سر سید نے یوں بیان کیا:

> جو لفظ سخت اور خراب سے خراب ان کی نسبت استعمال کیے جائیں وہ سب درست اور بجا ہیں اور اسی سبب سے ان سویلائزڈ الفاظ سے جو انڈین ابزرور میں آرٹیکل لکھنے والے نے ہم مسلمانوں کی نسبت لکھے ہیں، ہم کو کچھ کر ناراضی نہیں ہوتی بلکہ اس قسم کی تحریر سے ہم کو توقع ہوتی ہے۔[10]

نوآبادیاتی نظام میں صرف اُردو سے نفرت سے مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں بن گئیں، جو دو قومی نظریہ کی اساس اور بعد میں یہی نظریہ پاکستان کی اساس بنا۔ لیکن مسلمانوں کے لیے انھوں نے جو راستے ہموار کر دیے وہ بالکل الگ تھے اور سخت تجزیوں کے بعد اس راہ پر چلنے کی ضرورت پڑی۔

مسلمان نوآبادیات اور برطانوی نوآبادیات میں ایک قسم کی فرقہ بازی ہی ہے۔ بر صغیر کے بہت سے خطوں پر قابض ہونے کے لیے آپس میں دست و گریبان ہو گئے۔ مسلمانوں کے ہندوستان پر ترکی اور سعودی عرب کی نسلوں نے حکومت کی۔ انگریزوں کی حکمرانی کا اصل مقصد بر صغیر پاک و ہند کو معاشی معاشرتی ہر لحاظ سے ان کو تباہ کرنا تھا۔

نوآبادکار جاگیردارانہ نظریے پر ہی محیط ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ جاگیر میں باقاعدگی سے ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس تفریق کے باعث دور وسطیٰ کا امپیریل ازم انسانوں کی جدوجہد کا ایک خصوصی نظریہ وجود میں آتا ہے۔ آرتھوڈکس مارکس کے نظریۂ خیال سے دیکھیں تو ان اصول اور آداب و اطوار کا سرچشمہ، دولت اور نوآبادیاتی جاگیردار کے ہی معاشی نظام پر تھے۔ مثال کے طور پر سرمایہ داری نظام میں امیروں کے ہاں بہت زیادہ مال تھا۔ ان مال اور زر کو جدید تجارت میں لگا کر آگے مزید بڑھانے کا کوئی بھی نظام نہ تھا۔ اس وجہ سے اُس کو فیاضی طریقے سے اخراجات میں لگا دیا جاتا ہے۔ دوسری جانب جاگیردار زیادہ پیسوں کو صنعتی امور میں لگاتے ہیں تاکہ اس کو مزید ترقی دی جاسکے۔ یہ نوآبادت کا تسلسل ہی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فیض احمد فیض، صلیبیں میرے دریچے میں (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۳ء)، ۲۷۔

۲۔ ڈاکٹر انجم رحمانی، پاکستان میں تعلیم، ایک تحقیقی جائزہ (لاہور: پاکستان کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۰۶ء)، ۷۹۔

۳۔ دلارے لال بھار گو، ”ریڈیو اسٹیشن“، مشمولہ: سدھا (جلد ۲، شمارہ ۱۳، مارچ ۱۹۴۰ء): ۴۲۳۔

۴۔ لیونل فیلڈن، Report on the Progress of Broadcasting in India, up to 1939 (شملہ: گورنمنٹ آف انڈیا پریس، ۱۹۴۰ء)، ۶۶۔

۵۔ فرانچسکا اور سینی Broadcasting Empire: The BBC and the British world, 1922-1970, Langauge and Literat ure into the Age of Nationalism, (دہلی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۲ء)، ۲۴۔

۶۔ دلارے لال بھار گو، ”ریڈیو اور ہندی“، مشمولہ سدھا (جلد ۲، شمارہ ۱۳، مارچ ۱۹۴۰ء)، ۱۸۱۔

۷۔ خواجہ الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ۳۵۱۔

۸۔ ایضاً، ۲۳۹_۲۴۰۔

۹۔ ایچ مورس اسٹیفنس، انقلابی یورپ، مترجمہ: مولوی حسن عابد (حیدر آباد دکن: دار الطبع سرکاری عالی، جامعہ عثمانیہ، ۱۹۲۶ء)، ۳۶۷۔

۱۰۔ سرسید احمد خان، ”انڈین آبزرور اور مسلمان“ (تہذیب الاخلاق، بابت ۱۵ رمضان ۱۲۸۹ھ)، مشمولہ: مقالات سرسید، حصہ نہم، مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی (لاہور: مجلس ترقی ادب، دسمبر ۱۹۶۲ء)، ۲۰۸۔